رات کی بات

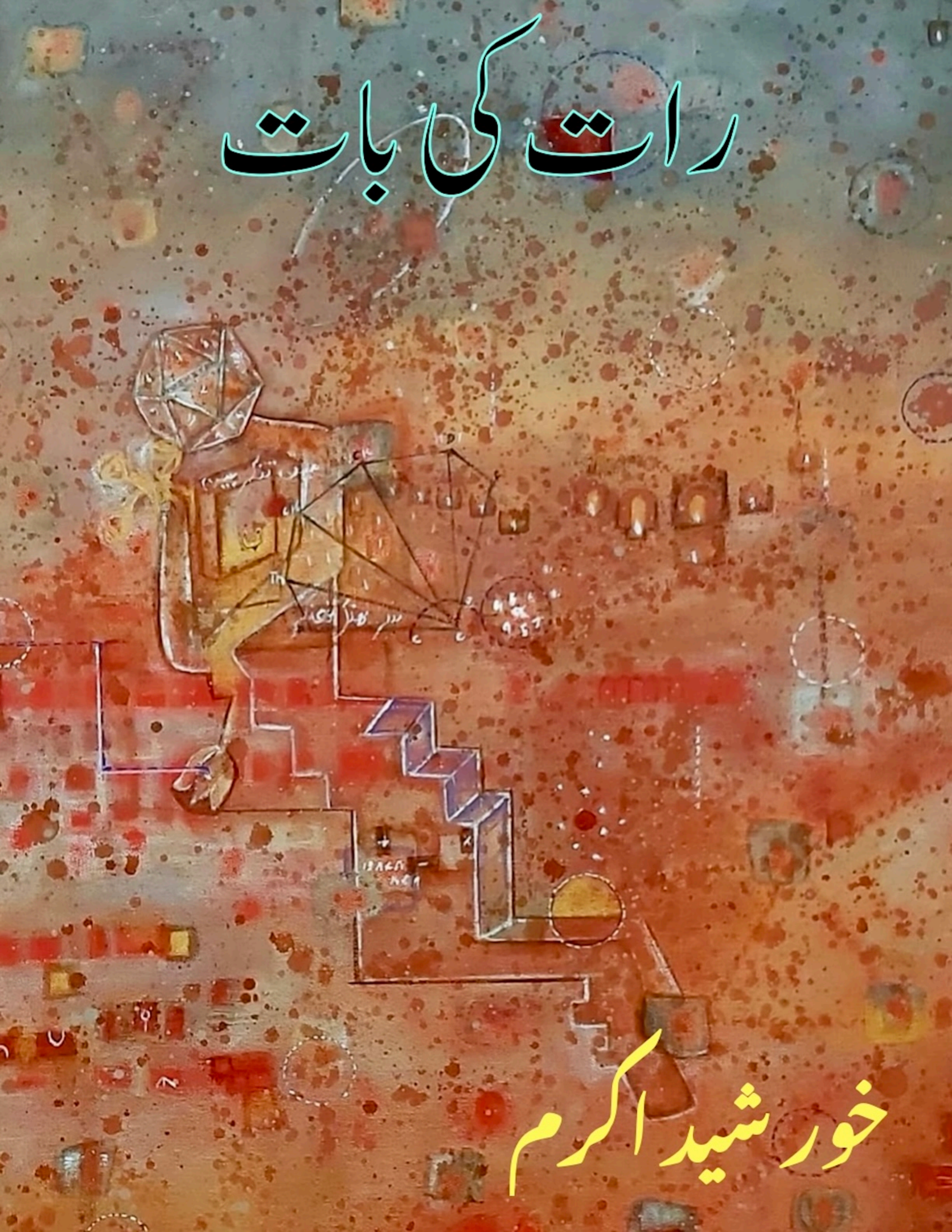

خورشید اکرم

رات کی بات

(افسانے)

خورشید اکرم

Cover Painting: Vazda Khan

مشرف عالم ذوقی

کی نذر

(تم سے ملنے سے پہلے میں خود کو کتنا کم جانتا تھا!)

خالد جاوید

اور

صدیق عالم

کے نام

(ع ہر نقش پابلند ہے دیوار کی طرح)

کہانیوں پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ خورشید اکرم کے وجود کو میں اپنے آپ سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا مگر فی الحال بحالت مجبوری میں ایک نقلی فاصلہ اپنے اور خورشید اکرم کے درمیان پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اگرچہ جو حضرات مجھ سے واقف ہیں انھیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ نقلی فاصلہ ایک واہمہ کے سوا کچھ نہیں۔ جس طرح ناروے کے بعض مچھیارے مچھلیوں کو جال میں پکڑنے کے لیے ایک مخصوص اور پر اسرار موسیقی کا استعمال کرتے ہیں اسی طرح خورشید اکرم زندگی، دنیا، روح عصر اور اپنے عہد کو گرفت میں لینے کے لیے اپنے افسانوی آرٹ کا بہترین اور انوکھا استعمال کرتے ہیں۔ زندگی ادیب کی گرفت میں آسانی سے نہیں آتی۔ وہ فن پارے میں سے چکنی مچھلی کی طرح پھِسل کر باہر نکل جاتی ہے۔ پھر فن پارے کے نام پر نرم صحافت کا ایک پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ خورشید اکرم کے افسانوں میں سے نہ تو زندگی باہر نکل پاتی ہے اور نہ ان کا عہد۔ وہ اپنے عہد کے مصائب میں ہمیشہ شریک نظر آتے ہیں (یہاں بھی ان کے فن اور زندگی کے درمیان کوئی خلیج نہیں ہے)۔ خورشید اکرم کے افسانے ہمیں ہمارے گناہ یاد دلانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بطور ایک افسانہ نگار، ان کا انفرادی اور اجتماعی تجربہ مل کر ایک وسیع تر اور حساس تخلیقی تجربے کا سبب بنتا ہے اور یہ تخلیقی تجربہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی وجود پر چسپاں احساس جرم، ریاکاری، بزدلی اور شرمندگی کی لکیروں سے بنے ہوئے نام نہاد اخلاقی اور روحانی

نقشے کو روشن کر کے رکھ دیتا ہے اور ہم اپنے آپ کو ٹھگا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ خورشید اکرم اپنے افسانوں کے کرداروں کے دُکھ اور سُکھ سے نہ دکھی ہوتے ہیں اور نہ خوش۔ وہ ان کرداروں کو، اپنے آپ ہی تشکیل ہوتے جانے کی مکمل آزادی دے دیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی زبان اور بیانیہ میں نئی جہات پیدا ہوتی ہیں۔ زبان کے اندر زبان۔ بیانیہ کے اندر بیانیہ۔ پھر زبان کے اندر زبان۔ پھر بیانیہ کے اندر بیانیہ۔ ان افسانوں کو پڑھتے وقت مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا جیسے میں کسی آئینہ خانے میں تنہا کھڑا ہوں۔ افسانے کی صنف میں ہمیشہ سے ہی ایک بنیادی خصوصیت موجود رہی ہے۔ یہ خصوصیت کہانی یا افسانے کی ماہیت میں ہی پوشیدہ ہے۔ کہانی اپنے آپ میں خود مکتفی ہو کر، گویا سانس لیتے اور دھڑکتے دل کے ساتھ زندگی اور کائنات سے اپنا رشتہ بنانا چاہتی ہے۔ زندگی کے ایک اک چیتھڑے سے گویا لتھڑ لتھڑ جانا چاہتی ہے۔ اس سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہونا چاہتی ہے اور خود کو زندگی کے سپرد کر دینا چاہتی ہے۔ کہانی کی یہ خصوصیت یقیناً ایک اسرار ہے۔ یہ بنیادی خصوصیت ہمیشہ سے اعلیٰ اور بلند ادیبوں کی کہانیوں اور افسانوں میں موجود رہی ہے۔ زندگی سے ایک گہرا جذباتی اور سنجیدہ رشتہ بنا پانے کی حسرت۔ اسی کو شاید کیتھرین مینسفیلڈ نے اپنی زبان میں Terrible desire to establish contact کہا ہوگا۔ مگر کہانی کے لیے اپنی یہ حسرت پوری کر پانا آسان نہیں ہے کیوں کہ کہانی

کی یہ محبوب، یہ زندگی، ہمیشہ چکنی مچھلی کی طرح اس کی گرفت سے باہر نکل جاتی ہے۔

خورشید اکرم کی کہانیوں میں زندگی اسی طرح قید ہے جیسے کسی فوٹو فریم میں وقت قید رہتا ہے۔

خالد جاوید

کسی کتاب پر اپنی رائے دینے سے میں عام طور پر ہچکچاتا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پائوں گا یا بیجا تعریف کا ایسا پل کھڑا کر دوں گا جو قدم رکھتے ہی ڈھہ جائے گا۔ زیادہ تر کتابوں کی پشت یا فلیپ پر دی جانے والی آرا اسی زمرے میں شامل ہوتی ہیں۔ مگر خورشید اکرم میرے ان دوستوں میں ہیں جن کے ساتھ میں یہ رسک لے سکتا ہوں۔ کلکتہ ہو یا دلی مجھے خورشید سے ملنے کی ہمیشہ بے چینی رہتی ہے۔ ان کے اندر لوگوں کو سمجھنے، انھیں اپنا بنانے اور تعلقات کے اندر ایک خوشگوار فضا قائم کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

سوشل میڈیا کے دنوں میں جب ساری دنیا ایک انگلی میں سمٹ آئی ہے، سیلف پبلسٹی کوئی برائی نہیں رہی اور معمولی سے معمولی قلمکار بھی انا کے نشے میں چور ہے جبکہ خورشید اکرم ایک ایسا قلمکار ہے جسے اپنے قلم کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کوئی چیز ہے جو انھیں ہمہ وقت بے چین رکھتی ہے، خود اپنی تحریروں پر خاک ڈالنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے آدمی کے گرد آپ گھیرا کیسے ڈال سکتے ہیں؟ پھر بھی اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ خورشید اکرم اچھا یا برا جو بھی لکھتے ہیں، چاہے وہ شاعری ہو یا فکشن یا تنقیدی مضامین، وہ ان کی اپنی تحریر ہوتی ہے اور آج کتنے قلمکار ہوں گے جن کے پاس یہ اثاثہ ہو۔

چونکہ اس کتاب کا تعلق فکشن سے ہے میں خورشید اکرم کے فکشن کے تعلق سے چند باتیں لکھ کر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا جس کی ضرورت ویسے بھی انہیں نہیں ہو گی کیونکہ ان پر لکھنے والے اچھی تعداد میں موجود ہوں گے۔ خورشید اکرم کو اتنے سالوں تک پڑھنے کے بعد میں نے جہاں تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ خورشید اکرم کا بیانیہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس کا تعلق واقعات سے نہیں بلکہ ان کے نتائج سے رہتا ہے، زندگی کی تلخ سچائیوں سے زیادہ ان کے چھوڑے ہوئے خس و خاشاک سے ہوتا ہے جس طرح سمندر کی موج لوٹتے وقت ساحل پر خار و خس کی ایک پوری دنیا چھوڑ جاتی ہے جس میں سڑی گلی چیزوں اور کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ سیپیاں بھی چمکتی ہیں اور ہم ساحل پر گھنٹوں کھڑے ہو کر اس لئے بور نہیں ہوتے کیونکہ سمندر ہمارے سامنے سارا وقت اپنے اسرار اگلنے میں مصروف رہتا ہے۔ خورشید اکرم کی کہانیاں بھی اپنی جگہ ٹھہری ہوئی نہیں رہتیں، ایک دائمی بے چینی کی شکار رہتی ہیں، شاید اسی لئے ہر قراءت پر نئی محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے ہر بار جب آپ ساحل پر پہنچتے ہیں تو سمندر وہ نہیں ہوتا جسے آپ چھوڑ کر گئے تھے، یہ پوری طرح بدل چکا ہوتا ہے۔

صدیق عالم

ترتیب

عذرِ گناہ۔۔۔	10
صورت گرہن	14
بلینک کال	37
آپ مجھے تم کہیے	64
بھول بھلیاں	81
رات کی بات	96
چیونٹیاں	114
پیشاب گھر	126
سات جمعرات	147
بجھی ہوئی تیلیاں	157
قصہ ایک بے لطف شام کا	176
کہانی ایک محبت کی	194
اپنے بے گانے	203

عذرِ گناہ۔۔۔

میری افسانہ نویسی کی عمر تقریباً پینتیس سال ہے اور یہ میرا فقط دوسرا مجموعہ ہے، جو پہلے مجموعہ 'ایک غیر مشروط معافی نامہ' (1997) کے پچیس برس بعد شائع ہو رہا ہے۔ اُس مجموعے میں کچے پکے دس افسانے تھے۔ میں تب اس مجموعے کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھا لیکن یار دلدار مشرف عالم ذوقی کا پیہم اصرار۔ تب اردو افسانہ نئی کروٹ لے رہا تھا۔ کم از کم تین نسل کے افسانہ نگار سر گرم تھے۔ افسانہ نگاروں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن پھر بھی میرے چند افسانے بزرگ ادیبوں اور نئے و سنجیدہ قارئین کو بھا گئے۔ مگر اپنے دل کی کہوں تو مارے باندھے کی اشاعت کے باعث میں خود اپنی کتاب سے جھینپا سا رہا۔ ناشر نے جو کاپیاں دی تھیں وہ جیسے تیسے صرف ان پڑھنے والوں میں تقسیم کر دیں جن سے میرے قریبی اور ذاتی مراسم تھے۔ کسی سینئر ادیب کی خدمت میں 'برائے مطالعہ'، 'برائے اظہار خیال' یا 'برائے تبصرہ' نہیں بھجوایا۔ مجھے اپنی اس بے نیازی اور اپنی ہی کتاب کے تئیں بے اعتنائی سے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ لیکن ایک دن